

سرگوشی میں کچھ کہا جو کچھ فصیل میں سے ایک روزن پر آنکھ جمائے
 فرمان اللہ تک نہ پہنچا..
 تم جیسا میرا بھی ایک بیٹا تھا..
 اس کا نام راہول تھا..
 میں اسے سوتے میں چھوڑ آیا تھا..
 تمہاری ماں مایا کو اور تمہیں سوتے میں چھوڑ آیا تھا..
 میرے گھوڑے کتھ کانے میرے قدموں پر اپنی تھوٹنی رکھ دی تھی اور
 میں نے اپنے شاہانہ لباس اور تاج شاہی کو اپنے سائیں کے حوالے کر کے سب
 آسائشوں کو تیاگ دیا تھا.. زروان کے لیے.. ایک لتصور کامل کی خاطر..
 نہ مجھے زروان ملا.. اور نہ وہ لتصور کامل جس کی جستجو میں میں نے ہر آسائش
 ترک کی.. اب اس ڈیزی کثر کے تخلیق کردہ گڑھے میں بے نام پڑا ہوں تو کیا تم
 میری سرگوشی سنتے ہو؟.. سب مایا ہے.. سب مایا ہے..
 گڑھے میں پڑے ایک سر کی سرگوشی کون سنتا ہے.. اس بچے نے بھی نہ
 سئی.. حالانکہ وہ اُس سے مخاطب تھا..
 یہ وہی صحن تھا جس میں بُرکشی کے مقابلے ہوا کرتے تھے..
 بکرے کے ایک دھڑ کے حصول کے لیے مخالف گھر سواروں کو چاکوں
 سے پیٹا جاتا تھا...
 طالبان کو یہ کھیل ناپسند تھا..
 کہ یہ شمال کی نمائندگی کرتا تھا..
 اب ان کا دور اختتام کو پہنچ رہا تھا تو اب صحن میں جگہ نہ تھی..
 گھوڑوں کے دوڑنے کی جگہ نہ تھی..
 اگرچہ اب یہاں ایک آسانی تو میسر تھی.. کھیلنے کو دھڑ بہت تھے.. بُرکشی

کے کھیل کے لیے سر کے بغیر بکرے کا ایک دھڑکار ہوتا ہے جسے مخالف گھڑ سوار سے چھینا جاسکے، اس پر جھپٹا جاسکے.. لیکن مسلسل خانہ جنگی کے باعث بکرے کیا ہو رہے تھے تو مقابل کے طور پر ان غیر ملکی طالبان کے دھڑ بھی استعمال ہو سکتے تھے.. یہی آسانی تھی..

چنانچہ قلعہ جنگی کے کچے صحن میں کھیلوں کے سامان بہت تھے..
فٹ بال بھی اور دھڑ بھی عام ملتے تھے..

البته بُزکشی کے کھیل کے لیے درکار گھوڑے نہیں تھے..

صرف ایک گھوڑا تھا جو تہہ خانے کے اندر ہیرے میں اپنے ادھڑے ہوئے ہے پر سے پونچھ ہلا کر مکھیاں بھی نہیں اڑا سکتا تھا..

اس تہہ خانے میں اترتے اترتے.. دھوپ جھجک جاتی تھی..

اور اس کی کرنوں میں دھول کے ذرے آتے تھے کہ وہ نابینا ہو رہی تھی..
یہ گھوڑا اپنے اس انجام سے بے حد خفا تھا..

وہ کبھی بُزکشی کے مقابلوں میں سرکش ہوا کرتا تھا اور کبھی ہرات کے مصور بہزاد کے تیمور نامہ کے صفحوں پر ایک ایسے جانور کی طرح مصور ہوتا تھا جو زندہ لگتا تھا.. وہ کبھی حسین گاہ کا ہوا کرتا تھا اور کبھی افلاک کی سیر کو نکلتا تھا۔ ایسے کہ اس کے سفید پر کائنات کے سفر طے کرتے تھے..

اور اب.. وہ اس تہہ خانے کی تاریکی میں ادھڑا ہوا پڑا اپنی ننگی پسلیوں پر سے مکھیاں بھی نہیں اڑا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے اس انجام سے بے حد خفا تھا..
صرف دھوپ ہی نہیں، اس کی کرنوں میں شامل قلعہ جنگی پر شوکتی ہواں سے اٹھتی دھول کے جوڑے تھے، وہ بھی تہہ خانے کی سری ڈھیوں سے اترتے جھکتے تھے اور اس کے باوجود اندر کا منظر ان کی سفید نابینائی کو بھی نظر آ رہا تھا۔

اپنے انجام سے خفا ایک گھوڑے کا ڈھانچہ.. جس پر مکھیاں یلغار کرتی

تھیں.. اس کے پہلو سے لگا ایک غلیظ.. بد بودار بالوں اور بڑھی ہوئی داڑھی والا ملیشیا کی شلوار قمیض میں برهنہ پا سفید نوجوان جس کی ایڑھیاں پھٹ پھکی تھیں اور انگلیوں کے ناخن ماس میں گھس چکے تھے..

اس سے پرے بھی بے حس و حرکت کچھ اجسام پڑے تھے..

ان میں سے کسی ایک کی آنکھ کھلی اور اس نے دھوپ کو سیڑھیوں پر دیکھا.. تھہ خانے میں اور تو کچھ دیکھنے کو نہ تھا نہ دکھائی دیتا تھا تو جس کی بھی آنکھ کھلتی تھی، وہ اوپر ان سیڑھیوں کو دیکھتا تھا کہ باہر دن ہے یا رات..

یہ ہاشم میر کی آنکھ تھی جو کھلی تھی اور وہ نقاہت کی دلدل میں دھستا بکشکل بولا۔ ”میرا ذہن بکشک رہا ہے.. بکشک کر ٹریڈ ٹاورز کی جانب جا رہا ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان کی جانب جو تین جیٹ ہوائی جہاز تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے تو ان کی کیبینوں میں جو کوئی بھی انہیں ادھر لے جا رہا تھا تو جب وہ ٹاور بر ق رفتاری سے اس کی قریب آ رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ پل دوپل میں صور پھونکا جائے گا اور وہ بھی آگ میں بھسم ہو جائے گا تو اس لمحے وہ شخص کیا محسوس کر رہا ہو گا.. میں یہ جاننا چاہتا ہوں..“

ان میں سے جو اپنی آنکھ کھول سکتا تھا اور بول سکتا تھا، اس نے آنکھ کھولی اور بولا۔ ”وہ مسکرا رہا تھا..“

”تم کیسے جانتے ہو؟“

”میں جانتا ہوں.. ایک امریکی گارڈ نے جب بارود سے بھرے ایک ٹرک کو بیر کوں کی جانب بڑھتے دیکھا تھا تو اس کا ڈرائیور بھی مسکرا رہا تھا.. اس قسم کے ڈرائیور ہمیشہ مسکراتے ہیں..“

”کیوں؟“

یہ ”کیوں“ کیا پتہ کدھر سے آیا تھا..

تہہ خانے کی اولین سیڑھیوں پر اترنی دھوپ نے.. بلکہ اسے دیکھنے سے
ان میں کچھ تو انائی آگئی تھی اور وہ بڑبڑا نے لگے تھے.. سوائے جانی کے..
جانی بھی بڑبڑا سکتا تھا، اگر وہ گھوڑے کا ایک پارچہ نگل لیتا..
وہ اس کی سرد مردہ پشت کے ساتھ لگا جیسے ماں کی گود میں سوتا تھا..
”کیوں؟“

”اخی مجھ سے پوچھتے ہو...“ عبد الوہاب بڑبڑا یا..
کہیں سے کوئی جواب نہ آیا صرف بڑبڑا ہٹ سنائی دی..
”نه پوچھو تب بھی جواب دیتا ہوں کہ کیوں..“

میں آں سعود میں سے ہوں ..

خاد میں حرمین شریفین میں سے ہوں ..

اگرچہ مجھے ان کی خاد میت کی اجازت نہ تھی ..

اس لیے کہ میرے بھیجے میں اور طرح کی سوچیں وار کرتی تھیں .. وہ صرف حرمین کے خادم نہ تھے۔ ”سفید گھر“ کے بھی خادم تھے ... میں بڑا بول نہیں بول رہا، تکبیر نہیں کر رہا لیکن میں تم سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں .. میں نے کیمبرج سے علم الامان کی ڈگری نمایاں پوزیشن میں حاصل کی تھی ... میرے پروفیسر یقین نہ کر سکتے تھے کہ عام طور پر ایک سعودی اول تو کیمبرج کے کسی کالج میں داخل ہونے کے تعیینی معیار پر پورا نہ اترتا تھا اور اگر وہ داخل ہو جاتا تھا تو اسے مزید تعلیم سے کوئی شغف نہ ہوتا تھا .. مزید عورتوں، مزید شراب اور مزید کاروں سے شغف ہوتا تھا .. اس لیے میرے پروفیسر میرے سعودی نژاد ہونے پر شک کرتے تھے، اگرچہ میں تھا .. لیکن اس اعلیٰ تعلیم نے مجھے کوئی راستہ نہ سمجھایا، کوئی راہنمہ دکھائی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ سب علم اور آگہی محض سراب ہے .. جیسے نجد میں سراب ہوتے ہیں .. میں اپنی ذات کے اونٹ کو اپنے علم اور آگہی کے چاپک سے پیٹتا چاہے کتنی ہی تیز فتاری سے سفر کیوں نہ کروں، مجھے کچھ حاصل نہ ہو گا .. میں کبھی بھی اس تلااب تک نہ پہنچ پاؤں گا جو میری پیاس بجا سکے .. میرا

حلق ان کھجوروں کے ذائقے سے کبھی آشناہ ہو گا جن کی مٹھاس کے لیے میں
ترستا ہوں ..

میرا باپ جس نے میرے ایسے درجنوں بچوں کا تجھ مختلف بیویوں میں
ڈالا اور وہ کبھی کبھار ہمارے نام بھول جاتا تھا اور اپنے خادم سے پوچھتا تھا کہ یہ جو
بیس برس کا ہے، اس کا کیا نام رکھا تھا.. آل سعود کے خادموں میں سے تھا.. بلکہ
اب بھی ہے ..

وہ ہر برس دو ماہ کے لیے جرمنی جاتا تھا..

اسے دنیا بھر کی قومیتوں میں سے صرف جرمن عورتوں کے بھرے
بھرے بدن شہوت سے بے اختیار کرتے تھے ...

اس کا پسندیدہ شہر ہیمبرگ تھا اور پسندیدہ علاقہ ریپا بہان ..

وہ وہاں زنا کاری کے لیے ہرگز نہیں جاتا تھا بلکہ عین شرع کی حدود میں
جاتا تھا کہ وہ نہایت متقدی اور پر ہیز گار تھا.. اب بھی ہے ..

جرمنی کے سفر کے دوران اس کے دو خصوصی خادم یا معاون ہوتے
تھے.. بہت پڑھے لکھے اور مقامی رسوم و رواج اور زبان میں تاک .. یعنی جرمنی کے
رسوم و رواج اور زبان اور ان کی تنخواہیں کسی آئینی بادشاہ یا ملکہ سے بھی کہیں
زیادہ ہوتی تھیں۔

وہ ہیمبرگ کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتے .. فٹ پا تھوں پر چلنے
والی آفس گرلز .. گھریلو عورتوں .. سٹورز میں شاپنگ کرتی ہوئی لڑکیوں ..
یونیورسٹی کی طالبات .. سڑکوں پر سے کوڑا اٹھانے والی خواتین .. غرض کہ ہر مادہ کو
عقاب کی آنکھوں سے دیکھتے .. کہ ان کی آنکھوں میں عورت کے بدن کی پیمائش
کا وہ پیانہ لگا ہوتا تھا جو میرے باپ کی جنسی طلب کے معیار پر پورا اتر تھا... ان
خادموں کو عین معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چھاتیوں کا سائز کیا ہونا چاہیے .. اس کے

کو لہوں پر کتنا گوشت درکار ہے اور اس کا دہن کتنا فراخ ہونا مصلحت کے مطابق ہے.. وہ کبھی بھی شکل و صورت کو نہیں پرکھتے تھے کہ اسے دیکھا نہیں جانا تھا۔ وہ صرف گلیوں، بازاروں اور ریستورانوں میں ہی ایسے گوہر نایاب کو تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ نائٹ کلبوں اور قبہ خانوں میں بھی جو خواتین ہوتی تھیں، انہیں بھی ناپتے تھے.. اور جو نہیں کوئی عورت اس معیار پر پوری اترتی تھی.. وہ اپنے بانڈ سڑیٹ کے سوٹ کا کالر درست کرتے.. پھر کارڈن کی نائی کی گرد سنبھالتے ایک نہایت تہذیب یافتہ لبجے میں اسے ایک پیشکش کر دیتے ...

نائٹ کلبوں، قبہ خانوں اور کسینوز میں تو انہیں کچھ زیادہ وقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا کہ وہاں چار جز طے شدہ ہوتے تھے۔ البتہ گلیوں، بازاروں اور سکولوں وغیرہ میں جو لڑکیاں پیانے پر اتر آتیں، انہیں مائل کرنے میں قدرے دشواری ہوتی ..

فراؤ لائن آپ کی شخصیت انتہائی متاثر گئی ہے اور حسن اس لائق ہے کہ آپ صرف ایک شب کے لیے ہمارے شیخ کی ذاتی مہمان بن جائیں.. وہ آپ کی دعوت کرنا چاہتے ہیں.. آپ کی تواضع کرنے کے متنمی ہیں اور.. اگلی صبح شکرانے کے طور پر اتنے ہزار ڈالر آپ کی مذر کریں گے ..

بہت کم ایسا ہوا کہ یہ پیشکش ٹھکرداری گئی ہو.. کیونکہ ایک عام آفس گرل.. ایک سیلز گرل یہاں تک کہ ایک گھریلو خاتون بھی اتنی بڑی رقم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بھی ایک رات کے عوض میں.. یورپی خواتین کے لیے جنسی رفاقت ایک معمولی بات ہوتی ہے.. اگرچہ وہ اپنی ذاتی پسند سے چنان وکر تی ہیں لیکن ایسی معمولی بات کے لیے اگر دو تین برس کی تینخواہ کے برابر رقم ملنے کی پیشکش ہو جائے تو یہ اتنی بڑی کشش ہوتی ہے کہ وہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔ ایک شب کے لیے ذاتی پسند کو تیاگ دینے میں کیا مصالحتہ ہے.. وہ اتنی رقم

سے ایک فلیٹ خرید سکتی تھیں اور بقیہ زندگی آسائش میں بسر کر سکتی تھیں۔ چنانچہ انکار کا امکان بہت کم ہوتا تھا..
صرف ایک بار انکار ہوا تھا..

صرف ایک مرتبہ ان دو خادموں کو ناکامی ہوئی تھی (وہ تقریباً میری عمر کے ہیں اور میرے دوست ہیں اور جرمی سے واپسی پر کہانیاں سنادیتے ہیں)۔
ایک معمولی سی لڑکی نے انکار کر دیا تھا..
اور وہ اتنی معمولی تھی کہ پبلک ٹائلش میں جمن شرایبوں کے فرش پر گرنے والے پیشاب کو ایک برش سے صاف کرتی تھی..
وہ اس معیار پر پوری اتر گئی..

استنے عامیانہ اور غلیظ کام کرنے والی ایک لڑکی تو پیشکش کرنے سے پہلے ہی پیشکش قبول کر لے گی بلکہ شکر گزار ہو گی..
اور جب پیشکش کی گئی تو واقعی وہ بے حد خوش ہوئی اور ہنس کر کہنے لگی کہ آپ لوگوں نے مجھے پسند کر کے ایک بہت بڑا اعزاز دیا ہے ورنہ جرمن لڑکے تو مجھے فربہ اور بحمدی گردانتے ہیں اور آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے.. لیکن میں یہ نہیں کر سکتی..

خادموں نے نذرانے کی رقم دو گئی کر دی تو وہ پھر بھی بہتی رہی کہ نہیں..
اور خیال رہے کہ وہ اتنی رقم چند برسوں میں تو کیا پوری زندگی میں نہیں کہا سکتی تھی.. پبلک ٹائلش میں صفائیاں کرتے، بول و بر از کی بُو میں سانس لیتے دن رات کرتے ساری عمر بسر کر کے پھر بھی وہ اتنی بڑی رقم.. صرف ایک شب میں حاصل نہیں کر سکتی تھی اور پھر بھی اس نے کہا کہ... نہیں!

خادموں کو الی معمولی مہترانی اور ان پڑھ سی لڑکی سے ایسے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی اور انہیں اپنے کانوں پر اس ”نہیں“ کا اعتبار نہ آیا تو انہوں نے

پوچھا کہ کیوں نہیں..

”اس لیے.. کہ“ مہترانی نے جرمن شرایبوں کے پیشتاب پر برش چلاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں طوائف نہیں.. بدن بیچنے والی نہیں.. میں کام کرتی ہوں اور روزی کمائی ہوں، اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“
خادموں کو شدید حیرت ہوئی کہ کفر کے اس معاشرے میں بھی رزق حلال کا انسپٹ موجود ہے..
میرا باپ شرع کا پابند تھا..

ہر سعودی کی مانند عادتاً نماز کا پابند تھا..

کوئی روزہ قضا نہیں کرتا تھا..

دونوں خادم کبھی بھی خالی ہاتھ نہ لوٹتے.. ناپ توں پر پوری اتر نے والی جو بھی لڑکی ساتھ لاتے تو میرا باپ.. شیخ.. اس کے اعزاز میں ہمبرگ کے گران ترین ہوٹل کے پورے فلور پر ایک وسیع دستر خوان بچا دیتا.. کھانے کے اختتام پر باقاعدہ اس کے ساتھ نکاح پڑھواتا.. اور اگلی صبح... طلاق طلاق..
میں نے بتایا ہے ناں کہ وہ شرع کی سختی سے پابندی کرتا تھا..

ہم بر ج کے قیام نے مجھے بہت بدل دیا تھا..

ایک سخت گیر بادشاہت کے ہر مہرے کے سامنے ٹھہر بہ لب رہنا اور اس کے سامنے جھکتے چلے جانا میرے لیے دشوار ہوتا گیا..

اس بادشاہت میں اگرچہ قانون کی سختی مثالی تھی لیکن اس سختی کے سامنے جب کوئی امریکی یا یورپی آتا تھا تو وہ موم ہو جاتی تھی..

ان غیر ملکیوں کی موجودگی اور ان کی قانون سے برتری میری عزت نفس کو مجرور کرتی تھی..

وطن ہمارا تھا لیکن حکمرانی ان کی تھی.. فوجی اڈے ان کے تھے جن کے

اندر سعودی جزل بھی نہیں جاسکتے تھے..

پھر یہاں افغانستان میں رو سیوں کی حماقت کا آغاز ہو گیا.. ہزاروں عرب ادھر آنکے اور القائد کے اسیر ہوئے.. میں بھی ان میں سے ایک تھا.. ان دونوں امریکہ اور پورا یورپ ہماری پیٹھ تھکتا تھا.. ہمیں مجاہدین کہا جاتا تھا اور ہماری جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھروسی جاتی تھیں.. یہی امریکہ مسلمان ملکوں کے نوجوانوں کو مقدس جہاد کے لیے ابھارتا تھا، بھرتی کرتا تھا، ٹریننگ دیتا تھا اور یہاں بھیج دیتا تھا.. تمہیں پتہ ہے کہ ادھر القائد کے جتنے بھی یکمپ ہیں اور تو را بور اور گردیز میں غاروں کا جو وسیع جال ہے، یہ سب امریکہ کے زیر نگرانی وجود میں آئے۔ ہم ان کے ہیر و تھے۔ ان کا بڑا ہیر و یبو بھی ہمارے شانہ بشانہ لڑتا تھا.. لیکن جو نہیں ”بدی کی سلطنت“ کا خاتمہ ہوا تو وہ ہاتھ جھاڑ کر نکل گئے کہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا.. ہم وہی مجاہدین اور ہیر و تھے جو 11 ستمبر کے بعد دہشت گرد اور بدترین مجرم بن گئے... پہلے یہ جہاد تھا کیونکہ روس مقابل میں تھا اور اب یہ قابل گردن زدنی ہے کیونکہ ہم اپنا دفاع کر رہے ہیں.. مجھے معلوم ہے کہ شمال والے ہمیں کبھی نہیں بخشنیں گے کیونکہ ہم نے طالبان کا ساتھ دیا ہے۔ شاندیہیں ہماری غلطی تھی.. ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا لیکن ہمارے لیے اور کوئی جائے پناہ نہ تھی.. بادشاہت میں ہم قدم نہیں رکھ سکتے تھے کہ اس قدم کو.. پہلے قدم کو کاٹ دیا جاتا اور ہمارا بقیہ دھڑ بعد میں گرتا.. ہم کدھر جاتے.. طالبان کو سپورٹ کرنا ہماری مجبوری تھی..

اگر علم اور آگہی سراب تھے.. صحرائے نجد کی مانند تو یہ جہاد بھی ایک سراب تھا..

جانی کی آنکھ بھی کھلی اور ذرلوں بھری دھوپ کو تیسری سیڑھی پر دیکھا.. اس نے سنا کہ عبد الوہاب کچھ بڑا رہا ہے.. اگر علم اور آگہی سراب تھے.. صحرائے نجد

کی مانند تو یہ جہاد بھی سراب تھا۔
اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں سورج سر پر آگیا تھا۔
دو پہر ہو چکی تھی..

یہ کوئی ایسا لمحہ تھا جب تھہ خانے میں سب کمین آنکھیں کھول رہے تھے.. اور سب کی آنکھیں ذرتوں بھری دھوپ پر تھیں..
مرتضی بیگ گھستا ہوا گھوڑے کے ڈھانچے کے قریب ہوا.. ناقانی سے
خیز کو گرفت میں لیا اور ڈھانچے کے اور قریب ہوا۔

جان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ ”میرے براوٹی کو مت مارو۔“
”یہ مر چکا ہے جانی.. اس کی پسلیوں کے ننگے پن کو جو کھیاں ڈھانپتی ہیں، وہ بتاتی ہیں کہ یہ مر چکا ہے.. ہمیں مزید گوشت کی توانائی کی حاجت ہے..
کچھ دیر اور زندہ رہنے کے لیے ہمیں اس کے پارچے نکلنے ہیں۔“
”ہم کیوں زندہ رہنا چاہتے ہیں بیگ..؟“

”زندہ رہنے کے لیے ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں جانی.. ہتھیار نہ ڈالنے کے
لیے۔ قید میں نہ آنے کے لیے..“

”بیگ ہمارے ساتھیوں نے مراحت کیوں نہیں کی.. ہر شہر میں لڑے
بغیر ہتھیار ڈالتے گئے یا پسپا ہو گئے.. کسی ایک مقام پر جم کر مقابلہ نہیں کیا..
کیوں؟“

”سنوجانی.. میں پاکستانی ہوں.. انہوں نے پورا ایک ماہ امریکیوں کی حشر
بمباری کی تباہی اور آگ کہی ہے.. اپنے سینیڈ سے ذرہ بھر مخفف نہیں ہوئے..
پورے ایک ماہ تک دنیا کی سب سے بڑی قوت کے سامنے کھڑے رہے ہیں،
سرگوں نہیں ہوئے.. میرے لیے ایک پاکستانی کے لیے یہی بہت ہے.. کیونکہ
میرے ملک کی تاریخ میں صرف چند روزہ جنگ کے بعد ایک معمولی دشمن کے

سامنے ہمارے تو ے ہزار سا ہیوں نے ہتھیار رکھ دیئے تھے اور جان کی امان چاہی تھی.. ان میں وہ مجر بھی تھا جو میرا پاپ تھا.. بعد میں یہی ہتھیار ڈالنے والے جزل ہمارے حکمران ہوئے اور پھر اپنی کرسی کو منحکم کرنے کی خاطر روسیوں کے خلاف جہاد میں شریک ہو کر عظیم مجاہد کہلائے.. تو میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔ ان کے جاہل ملا عمر نے کم از کم اپنا پستول مسکراتے ہوئے ان کے حوالے نہیں کیا.. تم سمجھ رہے ہو؟“

یہ نہیں کہ وہ دونوں اسی تسلسل اور روانی سے گفتگو کر رہے تھے.. نہیں.. وہ کبھی نہ حال ہو کر اوندھے ہو جاتے.. کبھی کھانے لگتے اور کبھی تادری چپ رہ کر اپنے بکھرتے سانس سننجلاتے۔

تہہ خانے کے روپوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں..

انہیوں نے گھوڑے کے جو پارچے نگلے تھے، ان کی عطا کردہ قلیل توانائی رخصت ہو چکی تھی اور بھوک ان کو پھر سے لا غر کرتی تھی..

گھوڑے کے ڈھانچے پر اجمان کچھ مکھیاں بور ہو کر اب ان کے غلیظ اور بد بودار بدنوں پر بیٹھ رہی تھیں لیکن ان کا ماس مردہ تھا، وہ محسوس نہیں کر پاتے تھے کہ اس پر مکھیاں بیٹھ رہی ہیں۔

بیگ نے بہت کوشش کی لیکن خیز کی دھار گھوڑے کے جھے ہوئے خون سے کند ہو چکی تھی اور وہ پارچے تراشنے میں ناکام ہو رہا تھا..

”پاکستانی..“ جانی نے گھوڑے کے گرد بانہیں لپیٹ رکھی تھیں۔ ”پلیز اسے اذیت مت دو.. اسے کچھ مت کہو.. یہ میری ماں ہے.. اسے نہیں کاٹو..“

بیگ اپنے نیم مردہ بازو میں سکت بھرتا خیز پر گرفت مضبوط کرتا گوشت کاٹ لینے کی سعی کرتا رہا.. مسلسل دانت سچینچے کوشش کرتا رہا..

یکدم جانی نے ایک کرب آمیز آہ بھری۔ ”یہ میرا بازو ہے بیگ.. جسے تم

کامنے لگے تھے..”

بیگ خوفزدہ ہو کر فوراً تھم گیا۔ رک گیا۔ ”کیا میں نے واقعی تمہیں زخمی کر دیا ہے؟“

”پتہ نہیں، مجھے کچھ محسوس نہیں ہوا۔ لیکن میں نے دھار کو محسوس کر لیا تھا۔“

”سوری جانی.. لیکن تم اپنے بازو پرے کیوں نہیں کر لیتے؟“

”مجھ میں ہمت نہیں ہے.. وہ گھوڑے کے بدن کے ساتھ جیسے چپک گئے ہیں..“

بیگ نے خبر رکھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو ڈھانچے سے جدا کیا، انہیں اٹھایا۔ وہ اسے بہت بھاری لگے اور اس کے سینے پر رکھ کر پھر سے اپنی جبوخ میں محو ہو گیا۔

”اس قیامت کی تاریکی میں کوئی دروازہ ہے؟“ چی پھی جہاں بھی تھا، وہاں سے اس کی نقاہت سے اکھڑتی آواز آئی۔

ہاشم میر نے سرد گوبر کے کیچڑی میں ایک اذیت ناک کروٹ لی۔ اسے کچھ دیر برداشت کیا اور پھر بولا۔ ”جہاں تیسری سیڑھی پر دھوپ ہے وہاں دروازہ ہے۔“ اس تھہ خانے کا۔ کیوں تم باہر جا کر ہتھیار ڈالنا چاہتے ہو؟“

”ہتھیار؟“ نہ صرف چی پھی یکدم چوکنا ہوا بلکہ باقی سب بھی سنائے میں آگئے۔ ”وہ کہاں ہیں؟“

”بھائی جی..“ اللہ بخش اب کہیں جا کر بولا تھا۔ ”وہ ساری بندوقیں شندوقیں یہیں کہیں ہیں.. کون کیا ہیں؟“

”کون کیا ہیں؟“ چی پھی میں چینخے کی قوت آگئی۔ ”اگر وہ تیسری سیڑھی سے نیچے آتے ہیں تو ہمیں دفاع کرنا ہے۔“

”کس کا دفاع کرنا ہے پھی پھی؟“

”اپنے تصور کا..“

”ویسے ان طالبان بے وقوف نے بامیان کے بُدھا کیوں تباہ کر دیئے

تھے؟“

”مت بھولو کہ ہم خود بھی طالبان کہلاتے ہیں۔“ بیگ گھوڑے کے پار پھر تراشنے کی کوشش میں جتا ہوا بولا۔ انہوں نے گولہ باری کر کے ان بتوں کو اس لیے پاش پاش کر دیا کہ وہ مت روک خدا تھے۔ ان علاقوں میں کبھی اس بدھا خدا کی حکمرانی چلتی تھی... پستش ہوتی تھی... مت روک خداوں پر ترس کھانا چاہیے اور انہیں ملیا میٹ کر دینا چاہیے۔“

”لیکن بیگ..“ یہ عبد الوہاب تھا۔ ”یہ جو محمود تھا غزنی کا.. جسے ہم بت شکن کہتے ہیں تو اس نے انہیں کیوں نہیں چھیڑا؟“

”یارا وہ جانتا تھا کہ ان کے اندر دولت مولت نہیں ہے۔“ گل شیر ولی نے جواز پیش کیا۔ ”ایسا بُت توڑنے سے فائدہ جس میں کچھ ہیرا جواہر نہ ہو۔“

”تو پھر.. انہوں نے ایسا کیوں کیا؟..؟“

”کس نے کہا تھا کہ طالبان میں بے وقوفی بہت ہے.. تو وہ ہے۔“

”اور کس نے کہا تھا کہ وہ مت روک خدا تھے؟“

”میں نے..“ بیگ نے فوراً جواب دیا۔

”بیگ.. کیا زمانے بدلنے.. وقت کے گزرنے سے خدا بھی مت روک

ہوتے جاتے ہیں؟“

”ہاں..“

”تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا آج کا خدا آج سے دو ہزار برس بعد

مت روک ہو جائے اور ان زمانوں کے لوگ اس کے تصور کو مسمار کر دیں؟“

”لا حول ولا..“ عبد الوہاب بڑیا۔ اور پھر فوراً مسکرا یا۔

”کیا یہ ممکن ہے بیگ؟“

”تم کفر بک رہا ہے یارا.. ہمارا رب ہمیشہ کے لیے ہے..“

”بدھ کے پچاری بھی جب بامیان کے مجتمعوں کے سامنے سر جھکاتے تھے تو یہی یقین رکھتے تھے کہ یہ ہمیشہ کے لیے ہے..“

”وہ توراہ راست سے بھلکے ہوئے کافر تھے، پر میں گارنٹی کرتا ہوں یارا کہ ہمارا رب ہمیشہ کے لیے ہے.. یہ کبھی متذکر نہیں ہو گا روزِ حشر تک..“

”کیا گارنٹی ہے؟“

”اوئے یہ کون ہے جو اللہ میاں کے لیے گارنٹی مانگ رہا ہے؟“ اللہ بخش غضبناک ہو گیا..

”میں تو نہیں تھا..“

”میں بھی نہیں تھا..“

”تو پھر کون تھا؟“

”کوئی بھی نہیں تھا..“

کچھ دیر خاموشی رہی.. بیگ اپنی کاؤنٹ میں مشغول رہا..

”تمہیں پتہ ہے کہ اس کی آنکھیں نیلی تھیں.. بلوسفار کی طرح..“

جانی اس بحث سے لا تعلق کہیں اور تھا.. یہ نہ جانتے ہوئے کہ بیگ اس کے بازوؤں کو گھوڑے کے ڈھانچے سے الگ کر کے اس کے سینے پر رکھ چکا ہے۔ یہ نہ جانتے ہوئے بھی بولا۔ ”اور ان میں ایک وحشی جانور والی کشش تھی.... اور وہ مجھے نہیں ملی.. میں نے اسے بہت تلاش کیا.. لیکن وہ مجھے ملتی تو بھی میں اسے کیسے جان سکتا تھا.. وہ ایک بر قعہ میں روپوش ہوتی..“

”لو جی امریکی نے بھی عاشقی معاشوی کی بات شروع کر دی ہے۔“ اللہ

بجھش بے حد خوش ہوا۔ ”آخر کو ہم لوگوں کا بھی تودل ہوتا ہے بھائی جی..“

”واللہ تم پر شمار ہونے کو جی چاہتا ہے امریکی.. اتنے دنوں بعد پہلی بار عورت کا ذکر آیا ہے.. ہم خوبیو اور نماز کا توڑ کرتے رہے اور تیسرا پسندیدہ شے.. عورت کو فراموش کر گئے.. کون تھی؟“

”عربی.. مجھے کیا پتہ، وہ کون تھی.. میں نے تو صرف اس کی تصویر دیکھی ہے۔ نیشنل جیو گر افک میں.. اس کی تصویر سرورق پر شائع ہوئی تو اس کے وجہی نیلے حسن نے امریکہ بھر میں تھملکہ مجادیا.. اور ہم سب اس پر عاشق ہو گئے.. وہ ایک افغان رویو جی لڑکی تھی جسے کسی پاکستانی یکمپ میں شوٹ کیا گیا تھا.. جس فونوگرا فرنے اسے شوٹ کیا، وہ صرف اس ایک تصویر کی وجہ سے ایک بین الاقوامی شخصیت بن گیا.. بہت سے تھے اور بہت امیر تھے جو اس سے شادی کرنا چاہتے تھے.. کچھ اسے اڈا پٹ کرنا چاہتے تھے لیکن وہ تولاکھوں مہاجرین میں سے ایک بے آسرا اور بھوکی لڑکی تھی.. ہم جس کو اس کی آنکھوں کی وجہی نیلا ہٹ سمجھتے تھے، وہ دراصل اس کی بھوک تھی.. شاند وہ مر چکی ہو.. شاند اس کی شادی ہو چکی ہو لیکن میں جب افغانستان آیا تو مسلسل اس کو تلاش کرتا رہا.. کہیں وہ نظر آجائے.. وہ نہیں ملی۔“

”تم اس کے لیے مسلمان ہوئے تھے؟“

”لا حول ولا...“ جانی شرمندہ ہو کر مزید مرد فی اور نقاہت میں اتر گیا۔

”لیکن وہ میرے حواس پر چھائی رہتی ہے۔“

”اور مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس قیامت کی تاریکی میں کوئی دروازہ ہے..؟“ ”چی پی پا کارا۔“

”اور میں نے کہا تھا کہ تیسرا سیڑھی پر دھوپ ہے۔ اس کے آگے دروازہ ہے۔ تم نے سنائیں.. لیکن تم کیوں پوچھتے ہو بار بار؟“

”کسی داغستانی سیانے کہا تھا کہ میں اس آدمی کی طرح ہوں جو اندر ہیرے میں کوئی دروازہ تلاش کر رہا ہے یا اس دروازے تک پہنچ گیا ہے لیکن یقین کے ساتھ یہ طے نہیں کر پا رہا کہ کیا اس کے اندر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں.. اور جانے سے کوئی فائدہ بھی ہو گایا نہیں.. اور اس دوران دروازے پر دستک بھی دیئے جا رہا ہوں.. تھپ تھپ تھپ..“

”ایسا کوئی دروازہ نہیں پھی پھی.. اگر کوئی ہے تو وہ صرف موت پر کھلتا ہے۔“

بالآخر کند خخبر کی مسلسل گڑ سے بیگ نے چند پارچے کاٹ لیے تھے.. گوشت اکڑا ہوا اور لکڑی کی ماں ند سخت تھا۔ ”ان کو نگل لو..“ وہ ایک پانچ کی طرح جو کہ وہ تھا، گھستتا ہوا ہر ایک کے قریب ہو کر اس کے منہ کے سامنے گوشت کا ایک لوٹھڑا معلق کر کے کہتا تھا اور لجاجت سے کہتا تھا۔ ”اسے پلیز نگل لو..“ اگرچہ اس نے جانی کو یہ پیش نہیں کی تھی لیکن اس نے سینے پر رکھے ہاتھ اٹھائے اور گھوڑے کے بچے بچے ڈھانچے کے گرد حائل کر دیئے۔ ”میں گھوڑے کو نہیں کھاؤں گا.. یہ مال ہے..“

”چی پھی.. ہو پھی پھی..“
 ”ہاں پاکستانی..“
 ”مر تو نہیں گیا..“
 ”ابھی نہیں..“

”چی پھی آج کیسادن چڑھا ہے کہ مجھ میں طاقت سی آگئی ہے.. جی کرتا ہے با تیں کرتا جاؤں، کرتا جاؤں.. اپنے اندر جختی باتیں ہیں کر جاؤں.. لو پھی پھی میں نے ناں عادت کے مطابق کہہ دیا کہ آج کیسادن چڑھا ہے.. اس تھے خانے میں تو دن رات برابر ہیں.. سیڑھیوں پر دھوپ ہے تو دن ہو گا اور نہیں تورات ہے.. پر اب رات ہو گئی ہے، میں جانتا ہوں.. دھوپ تیسری سیڑھی تک تو اتری تھی، پھر اٹھی اور روٹھ کر واپس چلی گئی۔ اس کی جگہ رات اتر آئی۔ یار پھی پھی رات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کون سی سیڑھی پر اتر چکی ہے.. یہ تو یار اندر و اندر چھٹے میں اترتی ہے اور ٹھپ اندر ہیڑا کر دیتی ہے..“

”اللہ بخش واقعی تم میں بولنے کی ہمت آگئی ہے... کتنا گھوڑا اکھایا تھا؟“
 ”نہیں پھی پھی، دین ایمان کی قسم، ایک بوٹی نگلی تھی۔ پر وہ بھی یوں باہر آئی ہے جیسے کسی تھہ خانے میں اترنے سے گھبراتی ہو.. پر مجھ میں آج بہت ہمت آگئی ہے.. میرا چُشہ کو رے گھڑے کی طرح نواں نکور اور سترہ محسوس ہوتا ہے۔“

پتہ نہیں کیوں..اوئے پچی چی مرجانیاں تیرائیں ہے کدھر ہے اور تو آگدھر گیا ہے..”

”تم مجھے پچی چی اس لیے کہتے ہوںاں کہ میں چیجنیا کار ہنے والا ہوں..”

”آہو.. ہمارے مولوی صاحب جب دعاماً نگتے تھے ناں تو ہمیشہ کہتے تھے،

یا اللہ کفار کو برباد کر دے.. طاغوتی طاقتوں کا ستیاناں کر دے اور ہم اپنی ثنڈیں جو

دھریک کے دھر کو نوں کی طرح ہوتی تھیں، ہلا ہلا کر جھوم جھوم کے کہتے تھے۔

”آمین آمین“ حالانکہ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ طاغوتی طاقتوں کیا بala ہیں.. پھر وہ دعا

ما نگتے تھے یا اللہ کشمیر، فلسطین اور پچی نیا کو آزادی عطا فرم اور ہم بلند آواز میں

”آمین آمین“ کہتے تھے۔ حالانکہ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ پچی پچی نیا ہے کہاں

اور ہے کیا؟ ملک ہے یا کوئی بندہ ہے.. ویسے پچی پچی اللہ تعالیٰ سے دل کی گھرائی سے

صاف پاک نیت سے جو دعاماً گلی جائے تو وہ ہر صورت قبول ہوتی ہے ناں؟“

”کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی.. دعاوں سے آزادی مل جاتی تو اب

تک مل چکی ہوتی.. گھر بیٹھنے کچھ نہیں ملتا.. جہاد کے بغیر آزادی نصیب نہیں

ہوتی۔“

”ہمیں تو جہاد کے ساتھ بھی کچھ نہیں ملا چی پچی.. ہم سے ہمارے پنڈ

کے ڈنگرا چھے ہیں، انہیں دانہ پانی اور چارہ ملتا ہے.. ان کی صفائی سترہائی ہوتی ہے۔

جہاں بیٹھتے ہیں تو ان کا گو بر صاف کیا جاتا ہے.. اور یہاں ہم اس اوترے نکھترے

گھوڑے کی لید میں پڑے ہیں.. پر یہ تمہارا چی پچی نیا ہے کہاں؟“

” بتایا تو تھا۔“

” آج پھر بتاؤ..“

جانی کی حالت بہت خراب تھی..

مرتفعی بار بار اس کے گالوں کو تھپکتا تھا اور اسے ان میں حرارت کا ایک

شاہد بھی محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب کبھی وہ اس کے گھوڑے کے گرد لپٹے

بازوالگ کرنے کی کوشش کرتا تو وہ تھوڑا سا بڑا تھا اور گرفت سخت کر دیتا تھا..
تو وہ زندہ تھا، سانس چل رہا تھا..

”چیخنیا کہاں ہے؟.. وہاں جہاں میری داوی نفیسه خاتون نے خواب میں
امام شامل کو دیکھا تھا.. یہ کبھی ایک جگہ نہیں رہا.. آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے.. زمین
تو وہی رہتی ہے۔ اس پر لئنے والے کبھی رخصت ہوتے، کبھی لوٹتے ہیں.. ہم
ہمیشہ سے عقاب رہے ہیں اپنی ہواویں میں پرواز کرنے والے.. لیکن روی ہمیں
شورش پسند کہتے تھے.. ان کے شالن نے ہماری آدمی سے زیادہ آبادی کو زبردستی
بے گھر کر کے دوسری ریاستوں میں بکھیر دیا.. ہمیں ہمارے چولہوں سے الگ
کر کے ایسے علاقوں میں بھیج دیا جہاں اتنی سردی تھی کہ چولہے جلتے ہی نہیں تھے..
ہم جہاں کہیں بھی تھے.. جارجیا، سائبیریا یا یوکرین میں تو ہم اپنی زمین اور گھاس
کی مہک کو ساتھ لے کر گئے۔ اپنے مذہب کو اپنی روایات کو فراموش نہیں کیا..
اپنے وطن کو یاد کرتے رہے اور ہر رات مغرب کی نماز کے بعد واپسی کی دعا میں
کرتے رہے.. اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ چیخنیا کہاں ہے اور کیا ہے.. اتنے برس
ہو گئے ہیں گھر سے نکلے..“

”چی چی..“ اللہ بخش میں آج بہت تھی، وہ گھسنے کی بجائے بڑی آسانی
سے رینگتا ہوا اس کے قریب ہو گیا۔ ”مجھے بھی ناں بڑے سال ہو گئے ہیں گھر
سے نکلے.. یا ہم گھر واپس جائیں گے..“

”نہیں اللہ بخش.. ہم گھر تو کیا سورج کی روشنی میں بھی کبھی نہیں جائیں
گے.. گھر جانے کے لیے ہی تو ہم نے شالیوں کے آگے ہتھیار رکھ دیئے تھے..
پشتون بھائیوں نے ہی ہمیں تسلی دی تھی کہ اب جنگ ختم ہو گئی ہے، جہاد کا وقت
نہیں.. ہتھیار رکھ دو اور اپنے گھر دل کو لوث جاؤ.. اس کے بعد جو ہوا تھا، وہ
تم جانتے ہو..“